Fikr-o-Nasar (Islamabad) 13:1 (1975)

محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

محمد اختر مسلم

حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف مسلمانوں ہی کے لئے خیر و برکت کا باعث نہیں بلکہ آپؐ کی آمد تمام بنی نوع انسان کے لئے بے پایاں سعادت و کامرانی کا سبب ہوئی۔ حضورؐ کی آمد سے پہلے بھی نورِ خداوندی ضیا بار ہوتا رہا مگر یہ ضو فشانی مختلف قبائل اور متفرق اقوام و ملل کے محدود دائروں میں ہوتی تھی۔ ہر ہر قبیلہ اور ہر ہر بستی کے لئے جداگانہ نبی تھے بلکہ بعض اوقات ایک ہی قبیلہ میں بیک وقت ایک سے زیادہ نبی ہوتے تھے۔ دنیا کا نظام قبائل اور چھوٹی چھوٹی اقوام میں منقسم تھا اور عام انسانیت کا سرے سے کوئی تصور ہی نہ تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی بھیڑوں کی گلہ بانی پر مامور تھے۔ حضرت موسیٰؑ اس قوم کے راعی تھے جو کنعان کے علاقہ سے ابھر رہی تھی اور سام بن نوح کے عقیدتی سلسلے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کا مقصد اس قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ بین الاقوامیت کا تصور ان دنوں ناپید تھا۔ ابھی عالمگیر اجتماعیت کا تصور اس قدر وسیع نہ ہوا تھا کہ انسانیت کا جامہ اس پر زیب دیتا۔ علوم و فنون پر یونانی، ایرانی، چینی، مصری، ہندی تہذیبوں کی چھاپ تھی۔

اس لئے انسانیت کے ہمہ گیر تصور کا پیدا ہونا محال تھا۔ انسانیت کا کوئی تصور تھا تو انہی قوموں کے حوالے سے تھا، خود قبائل و اقوام میں بھی ایک ترجیح یافتہ گروہ مختلف علوم و فنون پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ اور قوم کے باقی ماندہ افراد گویا ان ترجیح یافتہ افراد کے لئے غلاموں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے تمام انسانی حقوق سے محروم تھے۔ جملہ انسانی حقوق حکمران طبقے کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ اور عوام کے لئے کالانعام کا لقب استعمال ہوتا تھا جو دورِ شہنشاہیت تک مروج رہا۔ ہر قوم میں غلام ہوتے تھے جو انسانی حقوق سے بے بہرہ ہوتے اور انہیں انسان نہیں بلکہ نصف انسان سمجھا جاتا تھا

وہ بھی استحصالی مقاصد کی تکمیل کے لئے۔ یورپ تک میں علمائے حیاتیات اسی کے قائل تھے۔ ایسے حالات میں انسانوں میں ایک آزاد معاشرے کا بنیادی تصور کیوں کر پیدا ہوتا۔ ایک ایسا ارفع و اعلیٰ تصور جو جملہ بنی نوع انسان کو محیط ہو، اور انہیں انسانی حقوق سے نوازتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ سے پہلے جملہ مذاہب اور مکاتبِ فکر میں انسانیت کا مطلق تصور مفقود ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مطابق لاٹھی والے تو انسان تھے اور بقیہ سب انسان نما حیوان یا چوپایوں کا درجہ رکھتے تھے۔ بلاشبہ توریت اور انجیل میں بنی آدم کا ذکر ہے مگر بنی آدم سے مراد یا تو حضرت عیسیٰ لئے جاتے ہیں یا حضرت آدم کی اولاد، وہ آدم جو صرف سامی نسل کا جدِ اعلیٰ ہے۔ توریت اور انجیل میں یہ تصور ہی نہیں کہ سب انسان خواہ وہ اسود (کالے) ہوں یا احمر (سُرخ)، ابیض (سفید) ہوں یا اصفر (پیلے)، ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اس لئے یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ حضرت نوحؑ کے بیٹوں سے مختلف نسلیں چلتی ہیں۔ اسی لئے انہیں آدم ثانی کہا گیا ہے۔ مگر اصولی طور پر یہ کہیں نہیں آیا کہ سب انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ اگرچہ یہ اثر یہودیوں کی ایرانیوں سے مصاحبت کا نتیجہ ہے۔ ذات پات کی تفریق خالص آریائی نظریہ ہے۔ کیونکہ آریائی فلسفۂ فکر میں انسانی مساوات اور ہم اجدادیت کا تصور ہی نہیں، اگر ہے بھی تو کوئی قوم جدِ اعلیٰ کے پاؤں سے اور کوئی قوم اس کے پیٹ سے اور کوئی قوم اس کے بازوؤں سے اور کوئی قوم اُس کے سر سے پیدا ہوئی۔ اسی کو ورن آشرم کہا جاتا ہے۔ یہ نبی کریمؐ ہی کی تعلیم کا فیضان تھا جس نے ساری انسانیت کو ایک ہی شخص کی نسل قرار دیا۔ یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفسٍ واحدۃ (نساء-۱)۔ اور برملا کہا کہ کوئی انسان سوائے تقویٰ کے کسی پر فوقیت کا حق نہیں رکھتا۔ اصولی طور پر سب برابر ہیں اور کوئی شخص محض اس وجہ سے کسی قسم کی فضیلت کا حق دار نہیں کہ وہ ایک خاص نسل سے ہے یا فلاں کی اولاد سے ہے۔ انسانی وحدت کا یہ ایسا مکمل تصور ہے کہ اس سے کم یا زیادہ وجود میں آنا ممکن نہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اپنی ذات کو بھی اس ہمہ گیر تصور سے مستثنیٰ یا بالاتر قرار نہیں دیا۔ اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ میں بھی آدم کی اولاد ہوں۔

چنانچہ قرآن حکیم میں انا بشرٌ مثلکم کے الفاظ اپنی وضاحت آپ ہیں۔

اب رہتی دنیا تک کوئی نبی یا رسول پیدا نہیں ہوگا جو انسانیت کی ایسی مکمل و مستقل تعریف پیش کرے خالقِ ارض و سما نے انسانیت کے لئے اپنے دین کی رُو سے تخلیق انسانیت کا حقیقی نظریہ پیش کر دیا ہے

اور یہی نظریہ اسلام کا اصل اصول ہے۔

ہمیں اللہ تعالےٰ کے اس فضل عمیم اور احسان عظیم پر اس کا شکر بجالانا چاہیئے کہ اس نے ہمیں نبی آخرالزماںؐ کے ذریعے اسلام کا نور عرفان و ھدایت عطا فرمایا۔ اور اپنے مکمل ترین دین کا حلقہ بگوش بناکر ایک ایسا ضابطۂ حیات عنایت کیا جو ہر قسم کی خامیوں سے پاک ہے۔ اور جو ہر دور، ہر قوم، ہر ملک اور ہر معاشرہ کی ضرورتیں بدرجہ اتم پوری کر سکتا ہے۔ جسے اختیار کر کے ہم دنیوی سربلندی اور اُخروی سُرخ رُوئی سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں فوقیت صرف تقویٰ یعنی ذاتی عمل ہی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ نسلی امتیاز اور خاندانی تفوق اسلام کی رُو سے کسی فائدہ کا حامل نہیں۔

مفکرِ اسلام، حکیم الاُمت علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اسلام سے بڑھ کر انسان دوستی اور وسیع المشربی ہے کہاں؟ اسلام ہی نے سب سے پہلے وحدتِ انسانی پر زور دیا، اسلام ہی نے اخلاقی اور اجتماعی، ہر اعتبار سے اس کا کامل و مکمل تصور قائم کیا۔ لہٰذا اس کی حیثیت محض ایک خیال کی نہیں رہی، بلکہ ایک مؤثر، فعال اور فیصلہ کن عنصر کی ہے تاکہ بطور ایک حقیقتِ حیات، فرد اور معاشرے کی زندگی میں اس کا اظہار ایک عملی اور واقعی شکل میں ہوتا رہے، لہٰذا اُمتِ محمدیہ کی تشکیل ہوئی اور وہ سب امتیازات باطل ٹھہرے جو انسان اور انسان میں حائل اور اس کی وحدت کے منافی ہیں۔ اور جنہوں نے اقوام و اُمم کے جداگانہ تشخص اور طریقِ زندگی کی آڑ میں اب پھر سر اُٹھایا ہے جب تک یہ امتیازات اور گروہ بندیاں قائم ہیں، نہ انسانی دوستی اور وسیع المشربی میں کوئی معنی پیدا ہوں گے نہ افراد و اقوام کے اندر اس خالصتاً ضمیر کی تخلیق ہو سکتی ہے جس سے اس کا مستقبل وابستہ ہے۔ اس کی تخلیق ہوگی اور دنیا نی الواقع انسانی دوستی اور وسیع المشربی اختیار کرے گی تو اس اجتماعی عمل کی بدولت جس کی تکمیل کا ایک ہی ذریعہ ہے وہ ہے شریعتِ اسلامی کا اتباع۔" (اقبال کے حضور۔ مرتبہ سید نذیر نیازی۔ ص ۳۳۵)

معاشرتی انداز میں سوچا جائے تو اسلام نے حاکم و محکوم اور آمر و مامور کی تخصیص بھی ختم کر دی۔ گویا ایک ایسا معاشرہ وجود میں لایا گیا جس میں کوئی کام مشاورت کے بغیر طے نہیں پا سکتا، جس میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ ہر فرد معاشرہ کو مشورہ کا ناقابلِ انتقال حق دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ یہ مشورہ قوانین

خداوندی سے متعارض نہ ہو۔ اور یہ قوانین خداوندی دراصل فطرت انسانی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ تعالٰے کا کوئی قانون ایسا نہیں جو فطرت انسانی کے خلاف ہو۔ ان قوانین کی متابعت کرنے میں ہر انسان اپنی ہی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ گویا اتباع شریعت میں بھی انسانی محکومیت کا کوئی شائبہ موجود نہیں۔

اصولی طور پر لا قیصر و لا کسریٰ فرما کر حضور ختمی مرتبت نے شہنشاہیت کے امکان کو ختم کر دیا۔ اسلامی زندگی میں ایسا کوئی مرحلہ نہیں جہاں اختیارات لاہوتی (DIVINE RIGHTS) کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دیا جا سکتا ہو۔ اس طرح انسانیت اپنی طبعی آزادی کو حاصل کر لیتی ہے۔ انتظامی اولی الامر بھی دراصل عوام کے خادم ہیں۔ جو ان کی اجازت سے انتظامی امور سرانجام دیتے ہیں۔ لا قیصر و لا کسریٰ کے الفاظ ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قیصر مغرب کا نمائندہ تھا اور کسریٰ مشرق کا۔ چنانچہ ان دونوں کی نفی میں ایک تیسری طاقت جسے تیسری دنیا کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا وجود میں آئی۔ واضح رہے کہ مشرق و مغرب کی چپقلش اپنے پورے زور کے ساتھ حضورؐ کی بعثت کے وقت بھی موجود تھی۔ اور دونوں طاقتیں کسی نہ کسی رنگ میں باقی ماندہ دنیا پر اپنا اپنا تسلط قائم رکھنے پر مُصر تھیں۔ قرآن مجید کی سورہ الروم اسی صورتِ حال کی عکاس ہے۔ وہ آج کی طرح سیاسی اور معاشی مدد بھی دیا کرتی تھیں۔ مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی ایسی کسی امداد کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جزیرہ نما عرب ان دونوں قوتوں کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔ اور ایک آزاد تیسری دنیا کی حیثیت سے سامنے آیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان حالات میں مسلمان تیسری قوت نہ تھے۔ آج کے حالات میں بھی حضورؐ کی اس حکمتِ عملی سے تمسک کرنا چاہیئے اور اپنے آزاد وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ یہ تو سیاسی کش مکش کا نکتہ ہے جو ہمیں حضورؐ نے دیا۔ حربی آویزش میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ نے جو اصول مقرر کئے وہ آج تک رائج چلے آتے ہیں ان میں اصولی طور پر کوئی فرق واقع نہیں ہُوا۔ یعنی ناداروں اور غریبوں کو استحصال کرنے والے امیروں (مترفین) کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہنا چاہیئے۔ حق ہمیشہ مظلوموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ قرآن اس کی وضاحت سے بھرا پڑا ہے۔

علاوہ ازیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت سے متعلق خیر و برکت کی جو جو پیش گوئیاں تھیں وہ بھی دراصل مظلوم دنیا کی مرفہ الحالی کی علامت ہیں۔ حضورؐ کی ولادت کی برکت سے بارشیں مناسب انداز

میں ہوئیں۔ پھل کثرت سے پیدا ہوئے۔ اور فضائیں معطر و منور ہوگئیں۔ حضور پُر نور کی ولادت باسعادت کی منظر کشیوں اور ماحول نمائیوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو صوری و معنوی انداز میں یہ ساری نشانیاں ایک خوش حال، فارغ البال، حسین و جمیل دنیا کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ اس مسعود نومولود کی برکت سے دنیا میں جہل کی تاریکی علم و عرفان کے نور سے بدل جائے گی۔ پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہوگا۔ موسمی حالات نہایت خوش گوار اور دل آویز ہو جائیں گے۔ آسمان ستاروں سے چمک اُٹھے گا۔ کسریٰ کے محل کے کنگروں کا گرنا، آتش کدوں کا سرد ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اس بات کی علامات ہیں کہ حضورؐ کی انسانی تحریک سے ایک ایسا نور پھوٹے گا جس سے کائنات کی ساری ظلمتیں چھٹ جائیں گی۔ اور انسان اس تحریکِ علم سے اتنا فیض یاب ہوگا کہ زمین و آسمان کی تمام قوتوں کو اپنے تصرف میں لاکر انہیں انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دے گا۔ انسانیت پوری آزادی کے ساتھ اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی چلی جائے گی۔ امن، چین اور صلاح و فلاح کا دَور دَورہ ہوگا۔ اور بالآخر ایک ایسا فلاحی معاشرہ قائم ہوگا جو خود مکتفی ہوگا۔ اور ساری کائنات اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی۔

و اشرقت الارض بنور ربھا ۔ (قرآن حکیم - ۳۹ : ۶۹)

رہبر کامل، ہادیٔ برحق صلے اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے حلقہ میں شمولیت ایک ایسی سعادت ہے جسے "زورِ بازو" یعنی محض مادی قوت سے حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ اللہ تعالےٰ کی بخشش اور بندہ نوازی کا نتیجہ ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہم خداوند کریم کے عاجز و ناتواں بندے اس کی بے پایاں رحمت و عنایت پر ممنونیت و مسّرت کا اظہار کرتے ہیں کہ خداوند قدوس رحمان و رحیم نے پوری انسانیت کو ایک ایسا محسنِ اعظمؐ عطا فرمایا جس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر خوشی و شادمانی کا جتنا بھی مظاہرہ کیا جائے، ہم شکر گزاری کے حق کو ادا کرنے سے قاصر رہیں گے، جو اس سلسلہ میں ہم پر عائد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اسلام میں جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں اور معاملات سے متعلق واضح اصول اور احکام موجود ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ اور اُس کے آخری رسول نے ہمیں خوشی منانے اور شادمانی کا اظہار

کرنے کے بھی آداب بتائے ہیں۔ اور اپنے قلبی جذبات واحساسات کا اظہار کرتے وقت بھی ہمیں ہوشمندی کے ساتھ اسی ذات مبارک کے اسوۂ حسنہ اور ارشادات کو مشعلِ راہ بنانا چاہیئے اور اس سلسلہ میں جملہ غیر اسلامی طریقوں سے صَرفِ نظر کرنا بے حد ضروری اور لازمی ہے۔ ورنہ ہماری ایک جذباتی لغزش سے سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ اپنی قلبی مسرّت اور جذبات کی شدت کا ثبوت دینے کے لئے ہم آرائش وچراغاں کا بڑے جوش وخروش کے ساتھ اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف سڑکوں، اپنے محلوں، گلی کوچوں کو بقعۂ نور بنا کر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اصل اور اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہمارے دل ودماغ ایمان کی روشنی سے جگمگا اُٹھیں۔ ہم اپنی باطنی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کی پوری نیک نیتی کے ساتھ کوشش کریں۔ اور صحیح معنوں میں شمع رسالت کے پروانے ثابت ہوں۔

آپ کی تشریف آوری جہاں ہمارے لئے مسرّت وعید کا اعلان ہے اس کے ساتھ ہی محاسبۂ نفس اور تجدید عہد کا پیغام بھی ہے۔ آیئے ہم سب اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور سوچیں کہ ہم جس ذاتِ گرامیؐ سے وابستگی کے دعویدار ہیں اس کی حیاتِ طیبہ کو مشعلِ راہ بنانے اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کہاں تک کوشش کرتے ہیں۔

ہم جس طرزِ حیات اور نصب العین کے علمبردار ہیں اُسے ہماری عملی زندگی میں بھی کوئی دخل حاصل ہے یا نہیں۔ کیا ہم مظلوموں اور سائلوں کے قطعی اور حتمی حقوق کو ادا کرتے ہیں۔ کیا ہم انفاق فی سبیل اللہ اس طرح کرتے ہیں جس طرح حضورؐ اور حضورؐ کے صحابہ نے کیا۔ کیا ہم کسب حلال، بذل حلال اور اکلِ حلال کے سنہری اصولوں پر معاشرہ قائم کرنے کے لئے سر بکف ہیں اور طلبِ حلال کی خاطر جسے حضورؐ نے عبادت کا ۹/۱۰ حصہ قرار دیا۔ اسی طرح کوشاں ہیں جس طرح ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کوشاں تھے۔

خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ہمیں یہ عہد کرنا چاہیئے کہ ہم شمعِ رسالت سے اکتسابِ نور کر کے اپنی زندگی سے غفلت اور معصیت کی تمام تاریکیاں دُور کر دیں گے۔ اسی میں ہماری ترقی، ہماری بقا، ہماری ملّت کا استحکام اور ہماری نجات کا راز مضمر ہے اور اسی صراطِ مستقیم پر چل کر ہم اپنی عظمتِ رفتہ کو واپس لا سکتے ہیں۔

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

✽✽✽✽✽✽✽✽✽✽✽